© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

الحاد و بے دینی کے اس دور میں دین پسند لوگوں کو جس قسم کے نامساعد حالات سے قدم قدم پر سابقہ پیش آتا ہے اُس سے ہر وہ شخص پوری طرح آشنا ہے جس نے زندگی کے کسی مرحلے پر بھی غیر دینی قوتوں سے مصالحت کے بغیر زندہ رہنے کی کوشش کی ہے۔ لادینی قوتوں نے سیاسی تفوق حاصل کرنے کے بعد دنیائے اسلام میں ایک ایسا ماحول تیار کر دیا ہے جس میں نہ صرف بے دین طاقتوں کو غلبہ حاصل ہے بلکہ انہوں نے ایک لگے بندھے منصوبے کے تحت اس بات کا بھی پورا التزام کیا ہے کہ ہر لحظہ گمراہیوں کے طوفان اٹھتے رہیں، لوگوں کے دلوں سے خوفِ خدا اور فکرِ آخرت کی مقدس پنکھڑیاں مرجھا جائیں اور اُن کی جگہ دنیا پرستی اور فسق و فجور کی اکاس بیل ان کے دل و دماغ پر پوری طرح اپنا تسلط قائم کر لے۔ ان حوصلہ شکن حالات میں جبکہ دینی کام کرنے والوں پر ہر طرف سے یلغار ہو رہی ہے، دین کو بلند کرنے کی کوئی جدوجہد، خواہ وہ کسی شعبۂ زندگی میں کی جائے یا کسی طریق سے انجام دی جائے، بڑا ہی صبر آزما اور کٹھن کام ہے اور اس راہ کی مشکلات کا اندازہ کچھ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو محض ساحل پر کھڑے ہو کر طوفانوں کا نظارہ کرنے کے عادی نہیں ہیں بلکہ سمندر کے اندر اتر کر مخالفتوں کے تھپیڑے برداشت کرنے کے لیے بھی تیار ہوتے ہیں۔

باقی شعبوں کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف اسلامی لٹریچر کی تدوین و اشاعت کے متعلق بڑے وثوق سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو حضرات یہ کام کر رہے ہیں وہ واقعی بڑے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حوصلہ شکن حالات میں کام کر رہے ہیں۔ اس دور میں جبکہ جدید ادب کی لذتیت نے لوگوں کے مذاق کو بالکل بگاڑ دیا ہے کسی دینی کتاب کا شائع کرنا یا دینی رسالہ کا زندہ رہنا محض تائیدِ ایزدی ہے۔ ورنہ حالات تو ایسے "بے لذت ادب" کی اشاعت کے بالکل متحمل نظر نہیں آتے۔ یہ صرف اللہ تعالیٰ کی رحیمی اور کریمی کا کرشمہ ہے کہ ترجمان القرآن جیسا "خشک" پرچہ گذشتہ اکتیس سال سے مسلسل مذاقِ عام کے خلاف کام کر رہا ہے، نہ صرف یہ کہ اس پوری مدت میں تمام حوادث کے باوجود زندہ رہا، اور کامیابی کے ساتھ چلتا رہا، بلکہ اس کے "منصبِ رسالت نمبر" کو غیر معمولی مقبولیت نصیب ہوئی۔ اس پر ہم منعمِ حقیقی کی بارگاہ میں جس قدر سجدۂ شکر بجا لائیں کم ہے۔ یہ نمبر بلیس ہزار کی تعداد میں شائع ہوا ہے اور ابھی مزید مانگ آ رہی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ امتِ مسلمہ انکارِ حدیث کے گمراہ کن اور فتنہ انگیز پراپیگنڈا سے سخت تنگ آئی ہوئی تھی۔ اور اس کے مقابلے میں کسی معقول اور سنجیدہ طرزِ استدلال کے لیے سخت بیتاب تھی۔ وہ جب اس کے سامنے آیا تو اس نے اسے اپنی ہی گم شدہ متاعِ عزیز سمجھ کر جذب و شوق سے قبول کیا۔ ہمارے نزدیک تعداد کوئی اہمیت نہیں رکھتی کیونکہ اس رسالہ کی اشاعت کا مقصد نہ تو حصولِ شہرت ہے اور نہ جلبِ منفعت۔ اس کی غرض شروع سے صرف ایک ہی ہے کہ جس مقدس نظام کو حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ سے لیکر دنیا میں تشریف لاتے ہیں اسے ان کی ہدایت کے مطابق دنیا میں نافذ کیا جائے۔ اگر جاہ و مال کا حصول پیشِ نظر ہوتا تو پھر خطرات کو دعوت دینے کے بجائے اقتدار کے سایہ میں عافیت تلاش کی جاتی اور یہ کوئی مشکل کام نہ تھا۔ ہمارے نزدیک دیکھنے کی چیز وہ جذبۂ اخلاص ہے جس کے تحت لوگوں نے اس گراں قیمت اشاعتِ خاص کا خیر مقدم کیا ہے اور اس سے اس امر کا بھی بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس امت کی عظیم اکثریت سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق کس قسم کے پاکیزہ جذبات رکھتی ہے۔ اس پرچہ کی مانگ امت کے ہر طبقہ میں ہوئی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پروفیسر، وکلاء، تجار، کارخانہ دار، ملازمین، ڈاکٹر، اطبائ نئے تعلیم یافتہ اور قدیم درسگاہوں کے فارغ التحصیل، غرض سوسائٹی کا کوئی طبقہ ایسا نہیں ہے جس نے اس کی اشاعت میں اپنی بساط کے مطابق حصہ نہ لیا ہو اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ اس میں بہت سے ایسے حضرات بھی ہمارے شریک کار رہے ہیں جنہیں ہمارے ساتھ بعض مسائل میں شدید اختلاف رہا ہے۔ یہ سب اُسی کی رحمت کا نتیجہ ہے۔ اس میں ہماری اپنی محنت اور قابلیت کا قطعاً کوئی دخل نہیں ہے۔

اَللّٰھُمَّ نَسْئَلُکَ الثَّبَاتَ فِی الْاَمْرِ وَنَسْئَلُکَ عَزِیْمَۃً فِی الرُّشْدِ وَنَسْئَلُکَ شُکْرَ نِعْمَتِکَ وَحُسْنَ عِبَادَتِکَ وَالْفَوْزَ بِالْجَنَّۃِ وَالنَّجَاۃَ مِنَ النَّارِ

گذشتہ ماہ کے واقعات میں امت مسلمہ کے لیے جو واقعہ سب سے زیادہ دلفگار اور نتائج کے اعتبار سے سب سے زیادہ اہم ہے وہ ترکی کی فوجی عدالت کا وہ ناعاقبت اندیشانہ فیصلہ ہے جس کے تحت یاسیدہ کے جزیرے میں چار سو بانوے افراد کے خلاف مقدمہ چلا کر ۱۵ کو موت کی سزا، ۳۱ کو عمر قید کی سزا، اور ۴۱۸ کو ایک سال سے ۱۵ سال قید کی سزا دی گئی۔ جن بدنصیب ۱۵ افراد کو پھانسی کا حکم سنایا گیا ان میں سے ۱۲ افراد کی سزائے موت کو تو عمر قید میں تبدیل کیا گیا مگر ترکی کے تین نامور افراد یعنی سابق وزیر اعظم عدنان مندریس، وزیر مال فطین زورلو اور وزیر خارجہ حسین قورلتان کو پوری دنیا کے احتجاجوں، عرضداشتوں اور اپیلوں کے باوجود تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا۔ اور حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ خونیں ڈرامہ اس سرعت کے ساتھ کھیلا گیا کہ دنیا محوِ حیرت رہ گئی اور عام طور پر لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ عدالت کی یہ ساری کارروائی اوّل تا آخر محض ایک ڈھکوسلا تھی جس کا مقصد ہی مندریس اور اس کے ساتھیوں کو ٹھکانے لگانا تھا۔ انصاف کی تاریخ کا یہ دلچسپ ترین مقدمہ تھا کہ اس میں صفائی کے گواہ بھی استغاثہ کی طرف سے پیش کیے گئے تھے اور صفائی کے لیے وکیل بھی حکومت ہی نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مقرر کیا تھا۔ پھر اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جب حکومت کے اپنے مقرر کردہ وکیل صفائی نے اپنے مؤکل کے حق میں زوردار دلائل پیش کیے اور استغاثہ نے محسوس کیا کہ اس کا مکر و فریب آشکارا ہونے لگا ہے تو وکیل صفائی کو فوراً گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے بعد ان بے کسوں کی صفائی کے لیے جو دوسرا وکیل مامور ہوا وہ چونکہ اپنے سامنے حق گوئی کا حشر دیکھ چکا تھا اِس لیے اس نے کذب و باطل کے آگے سرنگوں ہونے ہی میں اپنی عافیت سمجھی اور استغاثہ کی ہاں میں ہاں ملاتا چلا گیا۔ مقدمہ کے دوران میں ملزموں کے ساتھ "عدالت" پے در پے تذلیل اور درشتی کا جو رویہ ظاہر کرتی رہی اس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ دراصل یہ عدالت نہیں ہے بلکہ استغاثہ ہی کا ایک شعبہ ہے۔ پھر دوران مقدمہ میں ان ملزموں کو جو اذیتیں دی گئیں اور اُن کے ساتھ جو وحشتناک سلوک روا رکھا گیا وہ ایک دلخراش داستان ہے۔ ان بدنصیب لوگوں میں بہت سے ایسے تھے جو ان تکلیفوں کو برداشت نہ کر سکے اور اپنے حواس کھو بیٹھے، حتیٰ کہ بعض نے اس اعصابی کش مکش اور خوف و ہراس سے نجات پانے کے لیے خودکشی کر لی۔

یہ عدالتی ڈرامہ اپنی مضحکہ خیزی میں اور اس کا ڈراپ سین اپنی ہولناکی میں اُس ڈرامے سے کچھ بہت زیادہ مختلف نہیں ہے جو چند سال پہلے قاہرہ میں اخوان المسلمین کے خلاف کھیلا گیا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر یہ بات ظاہر کر دی ہے کہ مسلمان ملکوں میں مغربی تہذیب کے دلدادہ اور لادینی کے علمبردار حضرات جس روشن خیالی، جس وسیع النظری (لبرلزم)، جس جمہوریت، اور جن اعلیٰ اصولوں کی پیروی کے مدعی ہیں، ان ساری چیزوں کی حقیقت کیا ہے۔ دراصل یہ لوگ جہاں بھی ہیں اپنی مسلم قوم کی عظیم اکثریت کے اندر ایک بہت چھوٹی سی اقلیت ہیں جسے نظم و نسق، تعلیم، عدالت، فوج اور معیشت میں مضبوط پوزیشن حاصل ہو گئی ہے۔ اب یہ اقلیت محض اپنی طاقت کے بل بوتے پر اپنی مرضی زبردستی اپنی قوم پر مسلط

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرنے کی کوشش کر رہی ہے اور اس کوشش میں جمہوریت، آئین، قانون، انصاف، اور معقولیت ہر چیز کو اس نے بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ مذہب کا راستہ روکنے کے لیے وہ ہر بازی کھیلنے اور ہر چال چلنے کے لیے تیار ہے، اور اہلِ مذہب پر جن برائیوں کا وہ الزام رکھتی ہے اس سے ہزار گنی زیادہ برائیوں کا وہ خود مظاہرہ کر رہی ہے۔

ترکی میں ملک کی فوج نے جس کا اصل فرض وطن کی حفاظت اور پاسبانی کرنا تھا، آئین کو پامال کر کے اور سیاست میں بے جا مداخلت کر کے خود اپنے ہی بھائی بندوں کے ساتھ جو ظلم کیا ہے وہ تاریخ کی ایک نہایت ہی اندوہناک داستان ہے۔ یہ اسی کی مداخلت کا نتیجہ ہے کہ جن لوگوں کو قوم کی اکثریت کا اعتماد حاصل تھا وہ زبردستی ہٹا کر پھینک دیئے گئے اور عصمت انونو کی پارٹی جو بہت چھوٹی اقلیت کی نمائندہ تھی رائے عام کی تائید حاصل کیے بغیر اوپر اٹھا لائی گئی۔ اس اکھیڑ پچھاڑ میں جن لوگوں کو گرایا گیا انہیں صرف گرانے ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ انہیں پھانسیوں پر بھی لٹکا دیا گیا۔ یہ شدید جذبہ انتقام کچھ اس وجہ سے نہ تھا کہ عدنان مندریس اور جلال بایار مذہبی گروہ کے لوگ تھے اور لادینی نظام سے دینی نظام کی طرف ملک کو پلٹائے لیے جا رہے تھے۔ دنیا جانتی ہے کہ وہ بھی مصطفیٰ کمال کے متبعین ہی میں سے تھے اور اسی سیکولرزم کے قائل تھے جس کے عصمت انونو اور یہ فوجی حضرات ہیں۔ دراصل ان کے خلاف یہ سارا غصہ اتنی سی بات پر تھا کہ مذہب اور اہلِ مذہب، کو جنہیں ترکی مسلمانوں میں ۹۹ فی صدی سے بھی زیادہ اکثریت حاصل ہے، انہوں نے ذرا سی ڈھیل بھی کیوں دی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر کہیں اکثریت کے منشا کے مطابق مذہب کے حامی برسرِ اقتدار آتے نظر آتے تو یہ "روشن خیال" اور "وسیع المشرب" (لبرل) لوگ، جو آج بھی جمہوریت کے ڈھول پیٹ رہے ہیں، اپنی روشن خیالی اور جمہوریت پسندی کے کیسے نمونے پیش کرتے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ترکی میں یہ جو کچھ ہوا ہے وہ درحقیقت اس وسیع کشمکش کا بالکل قدرتی نتیجہ ہے جو دین پسند طاقتوں اور لادینی قوتوں کے درمیان گذشتہ ایک صدی سے پوری دنیائے اسلام میں جاری ہے۔ ترکی ہی وہ ملک ہے جس میں یہ کشمکش سب سے پہلے کھل کر نمودار ہوئی اور اس کے نتائج پوری آب و تاب کے ساتھ دنیا پر آشکارا ہوئے۔ اس لیے اس ملک کے حالات کا مطالعہ مسلمانوں کے لیے از حد ضروری ہے۔

ترکی ایک ایسا ملک ہے جو مغربی ممالک کے عین درمیان واقع ہے۔ کئی صدیوں تک وہ اہلِ مغرب سے برسرِ پیکار رہا۔ پہلے اس کی جنگ فاتحانہ تھی پھر مسلسل دو صدیاں ایسی گزریں جن میں وہ اہلِ مغرب سے شکست پر شکست کھاتا چلا گیا، حتیٰ کہ جنگِ عظیم اوّل میں اس کی شکست انتہا کو پہنچ گئی۔ ابتداءً یہ شکستیں صرف مادی تھیں۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ مکمل دماغی و روحانی شکست میں تبدیل ہوتی چلی گئیں۔ آدمی کا خاصہ ہے کہ جب وہ کسی مدِّمقابل سے پٹتا ہے تو بڑا سخت جذبۂ انتقام اس میں ابھرتا ہے۔ لیکن جب وہ پے در پے مار کھاتا ہی چلا جاتا ہے تو آخر کار سخت مرعوبیت کے ساتھ ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ جنگِ عظیم اوّل کے خاتمے پر ترک اسی ذہنی کیفیت میں مبتلا تھا۔ اپنی پستی و ذلت اور مغرب کی برتری کو انتہائی عروج پر دیکھ کر اس کے جسم ہی نے نہیں، اس کے دل و دماغ اور اس کی روح نے بھی مغرب سے ہار مان لی اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب اپنے آپ کو اور اپنی قوم کو مغربی تہذیب و تمدن کے رنگ میں رنگ دینے، بلکہ پوری طرح جذب کر دینے کے سوا اور کسی چیز میں خیر نہیں ہے۔

اس عمل کا آغاز ۱۹۲۴ء میں "خلافت" کے خاتمے سے کیا گیا، اور اس کے بعد جلد ہی ترکی دستور کی وہ دفعہ منسوخ کر دی گئی جس کی رو سے سلطنت کا مذہب "اسلام" تھا۔ یہ تغیر ابتداءً میں تو اس دعوے کے ساتھ کیا گیا تھا کہ ہم سیاست کو مذہب سے الگ کرنا چاہتے ہیں، مگر کچھ دیر نہ گزری تھی کہ مذہب کو سیاست کے تابع کرنے اور پھر اس کی جڑ کاٹنے کا

© rasailojaraid.com

سلسلہ شروع ہو گیا۔ اسلامی شریعت جسے ملک میں قانون کی حیثیت حاصل تھی، منسوخ کر دی گئی اور اس کی جگہ سوئٹزرلینڈ کا دیوانی، اور اٹلی کا فوجداری، اور جرمنی کا تجارتی قانون لا کر نافذ کر دیا گیا۔ پھر شریعت کو مسلمانوں کے پرسنل لا کی حیثیت سے بھی باقی نہ رہنے دیا گیا، حالانکہ کفار تک نے مسلم ممالک پر قابض ہونے کے بعد اسے اس حیثیت میں برقرار رکھا تھا۔ وراثت میں عورتوں کا حصہ مردوں کے برابر قرار دیا گیا۔ تعدد ازواج کو قانوناً ممنوع ٹھیرایا گیا۔ اور طلاق کا اختیار مرد سے کلی طور پر سلب کر کے عدالت کے حوالے کر دیا گیا۔ قرآن کے صریح احکام سے یہ انحرافات اس بات کی کھلی علامت تھے کہ اب اسلامی قانون ترک مسلمانوں کی خانگی زندگی تک کا قانون بھی نہیں رہا ہے۔

دوسرا قدم یہ اٹھایا گیا کہ پورے ملک میں مذہبی تعلیم کے مدارس بند کر دیے گئے، سرکاری مدرسوں کے نصاب سے مذہب کی تعلیم خارج کر دی گئی، ابتدائی تعلیم کا پورا نصاب فرانس سے لا کر جوں کا توں نافذ کر دیا گیا، عربی رسم الخط کو قانوناً منسوخ کر کے لاطینی رسم الخط اختیار کیا گیا، ترکی زبان سے عربی و فارسی الفاظ خارج کرنے کی مہم چلائی گئی، عربی اذان کے بجائے ترکی اذان حکماً رائج کی گئی، اور قرآن مجید کی اصل عبارت کو بھی عربی حروف کے بجائے لاطینی حروف میں شائع کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان میں سے ہر تدبیر کا ہدف یہ تھا کہ ترکی قوم کا رشتہ اسلام اور مسلمانوں سے کاٹ کر اہلِ مغرب اور مغربی تہذیب سے جوڑ دیا جائے۔

تیسرا قدم لباس کی تبدیلی تھا۔ ۱۹۲۵ء میں مغربی لباس اور ہیٹ پہننا ترکی باشندوں کے لیے قانوناً لازم کر دیا گیا اور ایک خاص تاریخ مقرر کر دی گئی جس کے بعد کوئی شخص پبلک میں ہیٹ اور مغربی لباس کے سوا کوئی دوسری چیز پہن کر نہ آ سکتا تھا۔ اس تبدیلی کا مقصود یہ تھا کہ سارے ترک یورپین بن جائیں اور اہلِ یورپ بھی انہیں یورپین سمجھ لیں۔ لیکن امریکہ اور یورپ میں آج بھی ترکوں سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ آپ کا قومی لباس کیا ہے۔ کیونکہ ہیٹ اور سوٹ کو وہ جانتے ہیں کہ یہ ترکوں کا قومی لباس نہیں بلکہ مانگے کا لباس ہے۔ اور خود ترک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھی اب تک اسے اپنا قومی لباس نہیں سمجھتے۔ انتخابات کے زمانے میں لادینی اور فرنگیت کے بڑے بڑے علمبردار تک اندرونی ترکی میں جب ووٹ لینے جاتے ہیں تو ہیٹ پہن کر نہیں جاتے!

چوتھا قدم ترکی ناموں کا تغیر تھا۔ ۱۹۳۴ء میں ازروئے قانون لازم کیا گیا کہ ہر ترک اہلِ مغرب کی طرح اپنا ایک SURNAME اختیار کرے۔ بظاہر یہ ایک معمولی بات تھی لیکن دراصل اس طریقے سے جو تحریک چلائی گئی وہ یہ تھی کہ ترکوں کے نام مسلمانوں کے سے نہ رہیں، چنانچہ عملاً ایسا ہی ہوا۔ مثلاً ایک خاتون فاطمہ خانم سے بایان ویمیر بن گئیں، اور ایک صاحب کا نام نورالدین سے نوری ایڈن بنا اور پھر وہ صرف ڈاکٹر ایڈن بن کر رہ گئے۔ آج ترکی کے بکثرت نام اخبارات میں ایسے آتے ہیں جنہیں دیکھ کر بیرونی ممالک کے مسلمان یہ تصور تک نہیں کر سکتے کہ یہ مسلمانوں کے نام ہیں۔

اس پر مزید پردے کا خاتمہ، عورتوں اور مردوں کا آزادانہ اختلاط، اور مغربی ثقافت کے جملہ لوازم کا رواج تھا جسے درحقیقت اسلام اور اس کی تہذیب سے انقطاع پر آخری مہرِ توثیق سمجھنا چاہیے۔ پھر ۱۹۳۵ء میں ایک بہت بڑا "اصلاحی" قدم یہ اٹھایا گیا کہ جمعہ کی تعطیل کا دن موقوف کر کے اتوار کو عام تعطیل کا دن مقرر کر دیا گیا۔ شاید قومی ترقی کے راستے میں آخری رکاوٹ یہی باقی رہ گئی تھی۔

یہ تغیرات (جنہیں اہلِ مغرب اپنی اصطلاح میں "اصلاحات" کہتے ہیں اور ان پر تحسین و آفرین کے نعرے بلند کرتے ہیں) کچھ یونہی نہیں ہو گئے بلکہ انہیں انتہائی زبردستی اور سخت ظلم و ستم کے ساتھ نافذ کیا گیا۔ ترکی کے عام مسلمان اپنی دینداری اور اسلام پسندی میں دنیا کی کسی مسلمان قوم سے کم نہیں ہیں۔ وہ ان میں سے کسی تغیر پر راضی نہیں تھے اور نہیں ہو سکتے تھے۔ صرف ایک چھوٹی سی فرنگیت زدہ اقلیت یہ تغیرات چاہتی تھی، اور چونکہ اسے فوج ملکی نظم و نسق اور سیاسی نظام پر غلبہ حاصل ہو گیا تھا اس لیے وہ ایک ایک تغیر کو زبردستی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اپنی قوم پر ٹھونستی چلی گئی۔ ترکی کے مشرقی صوبوں میں اس پر پے در پے بغاوتیں ہوئیں ۱۹۲۵ء، ۱۹۲۹ء، ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۷ء کی بغاوتیں تو اچھی خاصی شدید تھیں۔ مگر ان کو پوری طاقت سے کچلا گیا اور ۱۹۳۷ء کی بغاوت کے بعد پورے ۹ سال تک مشرقی اضلاع میں مارشل لا نافذ رہا۔ دوسرے علاقوں میں اگرچہ کوئی مسلح بغاوت نہیں ہوئی لیکن اس غلط پالیسی کی بدولت قوم اور حکومت کے درمیان ایک خاموش کشمکش برپا ہو گئی۔ قوم کا دلی تعاون حکومت کو حاصل نہ رہا۔ تعاون کی جگہ عام لوگوں کی نفرت و بیزاری نے ایک پُرامن مزاحمت کی کیفیت پیدا کر دی۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترکی قوم کسی میدان میں بھی وہ ترقی نہ کر سکی جو قوم اور حکومت کے دلی تعاون کی صورت میں کر سکتی تھی۔ ترکوں کے ملک میں ذرائع و وسائل کی کمی نہیں ہے۔ ترکوں میں صلاحیتوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ ۲۷ سال کی مدت اس کے لیے بہت کافی تھی کہ وہ ترقی کر کے کہیں سے کہیں پہنچ جاتے۔ آخر اتنی ہی مدت میں جاپان اپنے قلیل ذرائع و وسائل سے مغربی قوموں کا ہمسر بن چکا تھا۔ مگر ترکی کے برسرِ اقتدار طبقے نے یہ قیمتی زمانہ اپنی ہی قوم کے عقائد اور ایمان و ضمیر سے لڑنے اور اس کی تہذیب و روایات کو کچلنے میں صرف کر دینا زیادہ پسند کیا، خواہ اس کا نتیجہ یہی کیوں نہ ہو کہ وہ ہر چیز میں امریکہ کے دریوزہ گر بن کر رہیں اور روس کا کابوس ہر وقت ان کے سر پر سوار رہے۔

اس مدت میں ترکوں نے یہ اچھی طرح دیکھ لیا تھا کہ ان کے حکمرانوں کی اس پالیسی نے انہیں کہاں پہنچا کر چھوڑا ہے۔ رسم الخط بدل کر وہ اپنے ماضی سے بالکل کٹ گئے اور صدہا برس کی علمی میراث جو انہیں اپنے اسلاف سے ملی تھی یک لخت ان کے لیے حرفِ بے معنی بن کر رہ گئی۔ مذہب کو زندگی سے خارج کر کے ان کی نئی نسلوں کے لیے اخلاق کی کوئی بنیاد باقی نہ رہی۔ اسلام کے رشتے کو تیاگ کر وہ دنیا کی تمام مسلمان قوموں سے قطعاً بے تعلق ہو گئے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور مشرق سے مغرب تک، کوئی ان کا ہمدرد نہ رہا۔ جن مغربی قوموں سے جڑنے کے لیے انہوں نے یہ سارے پاپڑ بیلے، وہ اس بات پر تو بہت دل کھول کر انہیں داد دیتی رہیں کہ وہ اسلام کی جگہ مغربی تہذیب اختیار کر کے بڑی روشن خیالی کا ثبوت دے رہے ہیں، مگر انہوں نے ایک دن کے لیے بھی انہیں اپنا نہ سمجھا اور نہ اپنے برابر کی حیثیت دی۔ اس صورت حال کی تلخی کو بے دین اقلیت تو محسوس نہیں کرتی تھی، مگر ان کی بہت بڑی اکثریت شدت کے ساتھ اسے محسوس کر رہی تھی اور اس کا مداوا کرنے کے لیے بیتاب تھی۔

۲۲-۲۳ سال تک حکومت کے بدلنے کی کوئی پُرامن آئینی صورت ترکی میں نہ تھی، کیونکہ ملک میں صرف ایک ہی پارٹی کی حکومت تھی اور از روئے قانون کوئی دوسری پارٹی وجود میں نہ آسکتی تھی۔ مگر ۱۹۴۶ء میں رائے عام کے دباؤ سے یہ قانون بدلنا پڑا اور کمالی انقلاب کے بعد پہلی مرتبہ دوسری جماعتیں وجود میں آنے کا امکان پیدا ہوا۔ اس طرح گرفت ڈھیلی پڑنے سے ترکی قوم کو یہ موقع مل گیا کہ "لادینی" کے پیروؤں ہی میں سے کم از کم ایسے آدمیوں کو انتخابات میں اُبھار کر لائے جو مذہب کے حامی نہ سہی، اس کی بیخ کنی کرنے والے تو نہ ہوں۔

قوم کے ان رجحانات سے ملک میں کوئی بھی ناواقف نہ تھا۔ سب جانتے تھے کہ قوم انتہائی دل برداشتگی کے ساتھ اُس پالیسی کی مار سہہ رہی ہے جو مصطفیٰ کمال اور عصمت اینونو زبردستی اُس پر ٹھونستے رہے ہیں۔ اس لیے مقابلہ میں دوسری پارٹی بننے کے مواقع پیدا ہوتے ہی کمالی پارٹی کے اپنے ممبروں میں سے بکثرت لوگوں نے یہ بھانپ لیا کہ قوم کے مذہبی جذبات سے اپیل کر کے وہ انتخابات میں حکمراں گروہ کو جیت کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۵۰ء کے انتخابات میں ٹھیک یہی نتیجہ رونما ہوا اور عصمت اینونو بھاری اکثریت سے شکست کھا کر جلال بایار اور عدنان مندریس کی پارٹی کے لیے جگہ خالی کرنے پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مجبور ہو گئے۔ بیندریس مرحوم کو خواہ کوئی شخص مخلص مانے یا منافق قرار دے، بہرحال اس امر واقعہ سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ ان کی کامیابی کی واحد وجہ یہ تھی کہ ترکی قوم مذہب کے معاملہ میں ان سے اعتدال اور ڈھیل کی توقع رکھتی تھی۔ یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ کمال اتاترک اور عصمت اینونو ۲۷ سال تک جس پالیسی پر ترکی کو زبردستی ڈھکیل رہے تھے، قوم اس پر راضی نہ تھی اور بے چینی کے ساتھ اسے بدلنے کے لیے موقع کا انتظار کر رہی تھی۔ یہ اُن لوگوں کے اخلاق و کردار پر ترکی قوم کی طرف سے ایک بدترین تبصرہ تھا جو جمہوریت کے جھوٹے نعرے بلند کر کے اپنی قوم کی گردن پر سوار ہوتے اور اس کی مرضی کے خلاف ربع صدی سے زیادہ مدت تک حکمرانی کرتے رہے۔

نئی قیادت جو رائے عام کی تائید کے ساتھ اُبھر کر سامنے آئی یہ خود اسلامی شریعت کی کس حد تک پابند تھی، اس کے متعلق اختلاف رائے کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اس قیادت نے عوامی خواہشات کا پورا پورا احترام کیا اور اس اعتبار سے اس کا یہ طرزِ عمل جمہوریت کے عین مطابق تسلیم کیا جانا چاہیے۔ یہ بات انتہائی مضحکہ خیز ہے کہ کوئی حکمران پارٹی اپنی قوم کی تمناؤں اور آرزوؤں کا خون کرنے لگے اور اُسے جوتے کے زور سے ایسے راستوں پر ہانکنے کا عزم کرے جنہیں وہ قوم اپنے لیے انتہائی خطرناک سمجھتی ہو۔ خصوصاً جمہوریت کا نام لے کر یہ استبداد پرلے درجے کی بد دیانتی ہے عدنان بیندریس اور اُس کے رفقاء کار نے ایمانداری کے ساتھ قوم کی اکثریت کے جذبات کا لحاظ کیا اور اسے اسلام کی طرف پلٹنے کے مواقع فراہم کیے۔ چنانچہ اُن کی ان کوششوں کا نتیجہ:

— مسجدوں کے دروازوں سے قفل کھل گئے۔ کثرت سے نئی مسجدوں کی تعمیر بھی ہوئی اور پرانی خستہ حال مسجدوں کی تجدید بھی کی گئی۔

— مسلمان قوموں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا گیا۔ عربوں سے تعلقات (باقی صفحہ پر)

© rasailojaraid.com